ترکی میں سیاسی وعسکری رسا کشی اور مستقبل کا نقشہ

حافظ محمد ادریس

ترکی میں صدیوں تک عثمانی خلافت کا جھنڈا لہراتا رہا۔ عثمانیوں نے نہ صرف بیشتر عالمِ اسلام کو متحد و منظّم رکھا بلکہ ترکی سے متصل یورپ کے بہت سے ممالک بھی ان کی خلافت کا حصہ بن گئے۔ ۱۴۹۲ء میں اسپین سے مسلم حکومت کا خاتمہ کرنے کے بعد یورپ میں جشن منائے جا رہے تھے کہ ان کو اُسی سال دوسری جانب سے اُٹھنے والی اسلامی لہر کا سامنا کرنا پڑا اور خلافت عثمانیہ کی فوجیں ویانا کے دروازوں پر پہنچ گئیں۔ یہ واقعات قصہ پارینہ بن چکے ہیں اور اُمت مسلمہ کے نزدیک تاریخ کی دبیز تہوں کے نیچے دفن ہو چکے ہیں مگر یورپ کے شاطر دماغ ان واقعات کو نہ فراموش کر سکے ہیں، نہ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا ہونے دیتے ہیں۔ یورپ میں چھپنے والی مختلف کتب میں بڑے سلیقے سے مغربی ذہنوں میں یہ بات راسخ کی جاتی ہے کہ ع ''بوے خوں آتی ہے اس قوم کے فسانوں سے''۔

خلیل نامی ترک کردار کے ساتھ یورپی کردار مائیکل کا مکالمہ بڑا دل چسپ ہے، جس میں خلیل کی ساری جدت پسندی، اباحیت پرستی اور اسلامی شعائر سے دُوری کے باوجود اسے قابلِ اعتماد قرار نہیں دیا گیا کیونکہ اس کی رگوں میں انھی لوگوں کا خون دوڑ رہا ہے جو صدیوں پہلے ویانا کا محاصرہ کرنے آئے تھے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد سقوطِ خلافت عثمانیہ کے بعد کی ۸۵ سالہ ترک تاریخ کا مطالعہ اس راز سربستہ سے آسانی کے ساتھ پردہ اُٹھا سکتا ہے کہ ترکی میں اسلام کا نام لینا کیوں ممنوع ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو ۱۹۲۳ء میں مغربی قوتوں ہی نے ایک گہری منصوبہ بندی سے ترکی پر مسلط کیا۔ اسی دور میں بننے والا سیکولر دستور مروجہ معنوں میں محض لادینی دستور نہیں بلکہ فی الحقیقت اینٹی اسلام دستور ہے۔ اس کے باوجود کیا یہ اسلام کا معجزہ نہیں کہ ترکی میں اسلام پسند سیاسی گروہ کافی عرصے کے بعد ملّی نظام پارٹی کے نام سے ۱۹۶۳ء میں میدان میں اُترے اور اس وقت سے سیاسی و عوامی

سطح پر ملّی سلامت، ملّی رفاہ اور دیگر ناموں کے تحت پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ترکی کی اس اسلامی تحریک کی بنیاد جامعہ ہندسیہ کے فارغ التحصیل نوجوان انجینیر نجم الدین اربکان نے رکھی تھی۔ یہ تحریک بدقسمتی سے کئی سال پہلے دو حصوں میں بٹ گئی۔ اصل اور بنیادی تحریک نے الگ ہونے والوں کو منحرف قرار دیا اور داخلی طور پر ان میں شدید باہمی تلخیاں اور رنجشیں پائی جاتی ہیں۔ یہ موضوع بہت نازک بھی ہے اور توجہ اور تحقیق کا مستحق بھی۔ دونوں جانب اپنے اپنے موقف کے لیے وزنی دلائل موجود ہیں۔ ہمارے لیے فی الحال اس بحث میں پڑنا موزوں نہیں۔

تحریک کا ایک گروہ بانیٔ تحریک پروفیسر نجم الدین اربکان کی قیادت میں سعادت اور پھر فضیلت پارٹی کے نام سے رجائی کوتان کی سربراہی میں پرانے منشور پر قائم رہا، جب کہ دوسرا گروہ طیب رجب اردوگان کی قیادت میں عدالت و ارتقا پارٹی کے نام سے میدانِ سیاست میں اترا۔ ۲۰۰۴ء کے انتخابات میں عدالت و ارتقا پارٹی ۵۵۰ رکنی اسمبلی میں ۳۶۳ نشستوں کے ساتھ واضح اکثریت حاصل کر کے تنہا حکومت بنانے کی پوزیشن میں آ گئی۔ اس سے قبل فوجی جرنیلوں کی شرپسندانہ سیاست کی وجہ سے سال ہا سال تک کوئی سیاسی پارٹی بھی پارلیمان میں واضح اکثریت حاصل نہ کرسکی۔ اس کا نتیجہ کمزور اور متزلزل حکومتوں کی صورت میں برآمد ہوا۔ یوں فوج کو اپنی من مانی پالیسیوں کو فروغ دینے میں سہولت رہی۔ ترکی کی فوج چار مواقع پر انقلاب برپا کرنے کی مرتکب ہوتی رہی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ ترکی کے سیکولر دستور کی حفاظت اس کی اولین ذمہ داری ہے!

ترکی کے سیکولر دستور کے اندر رہتے ہوئے سیاست کرنے کا اعلان کر کے طیب اردوگان نے ایک بڑا سنگ میل عبور کیا۔ انھوں نے خود کو ماڈریٹ اور سیکولر بھی قرار دیا۔ یہ اعلان سیاسی تجزیہ نگاروں کے نزدیک خوش آیند قرار پایا مگر فوج، عدالت اور کٹر لادین طبقات نے اسے 'محض سیاسی چال' قرار دیا۔ اردوگان پر شروع میں سیاست ممنوع تھی اس لیے عبداللہ گل وزیراعظم بنے جنھوں نے کچھ عرصے بعد اپنی پارٹی کے لیڈر طیب اردوگان کے لیے اپنا منصب خالی کر دیا۔ طیب اردوگان کے وزیراعظم بننے کے بعد اگلا مرحلہ صدارتی انتخاب کا تھا۔ اس کے لیے سابق صدر کی میعاد کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ آخر ۲۸ اگست ۲۰۰۷ء کو عبداللہ گل پارلیمنٹ کے ۵۵۰ ارکان میں سے ۳۳۹ ووٹ لے کر صدر منتخب ہوگئے۔ واضح رہے کہ ان کی صدارت میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے فوج اور دیگر لادین عناصر نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ۲۰۰۲ء کی منتخب پارلیمنٹ کو صدر کا انتخاب کرنا

تھا مگر لادین صدر اور عدلیہ فوج کے اشاروں پر رکاوٹ بن گئے۔ عبداللہ گل کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی مگر پارلیمنٹ میں حاضری کا کورم اپوزیشن پارٹیوں کے بائیکاٹ کی وجہ سے پورا نہ ہوتا تھا۔ ایک عجیب کش مکش جاری رہی۔ پارلیمنٹ اسی تعطل کے دوران برخاست ہوگئی اور جولائی ۲۰۰۷ء میں نئے انتخابات میں نئی پارلیمنٹ وجود میں آئی جس میں عدالت پارٹی کے ووٹوں میں ۱۲ء۷ فی صد اضافہ ہوا۔

عبداللہ گل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان کی اہلیہ محترمہ خیرالنساء سر پہ اسکارف باندھتی ہیں اور ترکی کے سیکولر دستور کو اسکارف والی خاتون اول سے 'خطرہ لاحق' ہے۔ بہرحال بامر مجبوری سیکولر حلقوں کو یہ کڑوی گولی نگلنا پڑی کیونکہ تمام قواعد وضوابط کے مطابق گل صاحب منتخب ہوگئے۔ عبداللہ گل اور ان کی اہلیہ ایوانِ صدر میں منتقل ہوگئے۔ اس کے اگلے ہی روز آرمی میڈیکل اکیڈمی کی گریجویشن پریڈ تھی۔ اس میں صدر صاحب کو دعوت دی گئی تو اسکارف پہننے والی خاتونِ اول کو سابقہ تمام روایات کے برعکس نظرانداز کر دیا گیا۔ صدر اس تقریب میں شریک ہوئے اور بہت اچھا خطاب بھی کیا مگر ان کے ساتھ بھی تمام روایات و آداب کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے امتیازی سلوک کیا گیا۔ ترکی کی جمہوری تاریخ میں پہلی بار چیف آف اسٹاف جنرل یاسر بوکانت نے صدر کو سلیوٹ نہ کیا۔ صدر نے ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ اس رعونت پر اپنا پُروقار ردعمل ظاہر کر دیا۔ اس بظاہر معمولی واقعہ سے سیاسی پارٹی کو عوام میں خاصی پذیرائی ملی۔

اس وقت سیکولر طبقے اور ان کے مغربی سرپرست حیران بھی ہیں اور پریشان بھی۔ حیران اس بات پر کہ ۱۹۶۳ء میں شروع ہونے والا اسلامی لہر کا سفر نہایت کامیابی سے جانب منزل جاری ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ۲۵ نشستیں، ۷۴ء میں ۴۸ اور پھر ہر اگلے انتخاب میں دگنا اضافہ! یہ ارتقا روز افزوں ہے۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں عدالت پارٹی کو ۳۴ فی صد ووٹ پڑے تھے، جب کہ ۲۰۰۷ء کے عام انتخابات میں اس کے ووٹوں کا تناسب ۴۶ء۷ فی صد تک جا پہنچا۔ لادینوں کو پریشانی یہ ہے کہ کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی اور کوئی تدبیر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی۔ سو ''اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا'' کے مصداق ترکی میں لادینی قوتیں بے بس اسلام دشمن مغربی عناصر مضطرب ہیں۔

اس وقت جو گرما گرم بحث چل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ فروری ۲۰۰۸ء کو پارلیمنٹ کے

۴۱۱ ارکان (۸۰ فی صد) نے دستور کی دفعہ ۱۰ اور ۴۲ میں ترمیم کر دی جس کے مطابق یونی ورسٹی کی طالبات ہیڈ اسکارف استعمال کر سکتی ہیں۔ پارلیمنٹ میں لادین طبقات بے بس ہو گئے کیونکہ اس میں عدالت پارٹی کے علاوہ دیگر پارٹیوں نے بھی عوامی رجحان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترمیم کی حمایت کی۔ فوج کے اشارے پر ملک میں بائیں بازو اور انتہائی دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے لادین عناصر نے اس فیصلے کے خلاف عوامی احتجاجی مظاہرے کیے۔ آرمی چیف نے بھی اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا اور اسے دستور کی روح کے علاوہ مصطفیٰ کمال کی فکر کو قتل کرنے کی کوشش قرار دیا۔ ۱۴ مارچ کو ترکی کے چیف پراسیکیوٹر نے ۱۶۲ صفحات پر مشتمل ایک فائل دستوری عدالت میں پیش کی اور پُرزور الفاظ میں عدالت سے درخواست کی کہ حکمران عدالت پارٹی سیکولر دشمنی میں تمام حدوں کو پھلانگ گئی ہے، اس پر پابندی لگائی جائے۔ واضح رہے کہ یہ ۱۱ رکنی دستوری عدالت وہ حتمی ادارہ ہے جس کے فیصلوں پر کوئی نظر ثانی نہیں ہو سکتی۔ اسی ۱۱ رکنی عدالت نے ۱۹۹۸ء میں نجم الدین اربکان اور ان کی رفاہ پارٹی کے خلاف فیصلہ دیا تھا جس میں نو ججوں نے فیصلے کے حق میں دو نے فیصلے کے خلاف رائے دی تھی۔ کوئی بھی فیصلہ لاگو ہونے کے لیے چھے ججوں کی حمایت ضروری ہوتی ہے۔ آج یہی نام نہاد عدالت اس نئے کیس کی سماعت کر رہی ہے جس کے سامنے درخواست کی گئی ہے کہ نہ صرف پارٹی پر پابندی لگائی جائے بلکہ وزیراعظم اور صدر سمیت عدالت پارٹی کے ۷۱ نمایاں سیاسی رہنماؤں پر سیاست میں حصہ لینا شجر ممنوعہ قرار دے دیا جائے۔

ادھر عدالت میں کیس زیر سماعت ہے اور ادھر فوج اس میں کھلم کھلا مداخلت کر رہی ہے۔ چیف آف اسٹاف جنرل یاسر بوکانت نے پریس میں ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا: ''ترکی کی سیکولر حیثیت مسلمہ ہے۔ برائی کے مراکز ترک دستور کے تقدس کو پامال کرنے میں مصروف ہیں''۔ عمومی خیال یہ ہے کہ دستوری عدالت منتخب حکومت کے خلاف فیصلہ صادر کر دے گی۔ لیکن اب حالات نصف صدی قبل سے کافی مختلف ہیں۔ ترک پارلیمان کے اسپیکر کوکسال توپتان نے انقرہ میں ۵ جون کو ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دستوری عدالت کے لامحدود اختیارات محدود کر دیے جائیں۔ ہمیں یک ایوانی پارلیمان کی جگہ دو ایوانی مقنّنہ کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے اور غیر منتخب اداروں کو ایوان کے تابع رکھنا چاہیے۔

اسپیکر کی اس بات کی حمایت میں بہت سے غیر جانب دار ماہرین دستور اور دانش ور بھی

منظرعام پر آ گئے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سنتوب ترکی کے دستوری ماہر ہیں۔ انھوں نے کہا: ''یہ اعلیٰ عدالت ملک وقوم کے لیے ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ قانون ساز ادارے کے بارے میں عدالت کا فیصلہ بالکل بے وقعت ہے۔ دستوری ترامیم جب قواعد وضوابط کے مطابق پارلیمنٹ میں منظور ہوجائیں تو ان کے اجرا کو کوئی نہیں روک سکتا''۔ واضح رہے کہ ترکی کا دستور دفعہ ۱۴۸ میں بیان کرتا ہے: ''ریاست کا کوئی ادارہ پارلیمنٹ سے برتر نہیں ہوسکتا''۔

اسکارف پر پابندی ہٹانے کے پارلیمانی فیصلے کے خلاف سیکولر عناصر نے عدالت سے رجوع کیا تو عدالت نے اس پارلیمانی فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یونی ورسٹی لا پروفیسر سیراب یزبیجی نے کہا: ''یہ فیصلہ قانونی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ عدالت نے اسکارف پر پابندی لگا کر پارلیمنٹ بلکہ خود دستور پر بھی اجارہ داری حاصل کرنے کی کوشش کی ہے''۔

یہ بحث جاری ہی تھی کہ نئے واقعات رونما ہونے شروع ہوگئے۔ یکم جولائی کو دارالحکومت انقرہ میں پولیس نے چھاپے مار کر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ۲۱ شدت پسند قوم پرست گرفتار کرلیے۔ ان میں دو معروف ریٹائرڈ جرنیل بھی شامل ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ وہ خفیہ طریقے سے منتخب حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کر رہے تھے۔ وزیراعظم طیب اردوگان نے ان لوگوں کو ارجن کون (Ergene Kon) سے متعلق قرار دیا۔ یہ تنظیم ترکی میں کافی بدنام ہے۔ اس سے پہلے بھی اس کے ارکان بم حملوں اور بڑی شخصیات کو قتل کر کے انقلاب برپا کرنے کے الزامات کے تحت گرفتار ہوتے رہے ہیں۔ ۱۶ جولائی کو ترکی ذرائع ابلاغ کے مطابق اس تنظیم کے مزید افراد گرفتار ہوئے جس سے گرفتار شدگان کی تعداد ۵۸ تک پہنچ گئی ہے۔ عدالتوں نے ان میں سے بعض لوگوں کو جن میں ایک ریٹائرڈ میجر جنرل بھی شامل ہے، ضمانت پر رہا کر دیا ہے۔ اس انتہاپسند تنظیم کی حمایت انجمن افکار اتاترک (Ataturk Thought Association) بھی کر رہی ہے جس کا صدر ایک ریٹائرڈ جنرل ایروگر (Eroger) ہے۔ وہ بھی گرفتار ہے اور ہنوز زیرحراست ہے۔

ان سطور کے شائع ہونے تک بہت سے دیگر حقائق بھی سامنے آجائیں گے اور ممکن ہے کہ عدالت کا فیصلہ بھی منظرعام پر آجائے۔ عدالت کو فیصلہ کرنے میں جلدی بھی ہے۔ اس کی عام فہم وجہ یہ ہے کہ عدلیہ کے ججوں کا تقرر صدر کے اختیار میں ہوتا ہے۔ دستوری عدالت کے گیارہ کے گیارہ جج سابق صدر احمد نجدت سیزر کے دورِ صدارت میں مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں سے بعض

کو اگلے سالوں میں ریٹائر ہونا تھا اور عمومی خیال یہ تھا کہ ان کی جگہ عبداللہ گل ایسے ججوں کو مقرر کریں گے جو کم از کم شدت پسند سیکولر نہ ہوں۔

بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا یہ ہے کہ اردوگان حکومت نے اسکارف کا مسئلہ عجلت میں اور ذرا قبل از وقت چھیڑ کر اپنے لیے مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن ترکی کی جدید تاریخ بتاتی ہے کہ مخالفین کے شر سے بالواسطہ ہمیشہ خیر برآمد ہوا ہے۔ اب بھی اگر عدالت اور ارتقا پارٹی پر پابندی لگتی ہے تو نیوزویک کے بقول اس کی مقبولیت میں ایک دم اضافہ ہو جائے گا اور اگر عدالت پابندی نہیں لگاتی تو اس سے بھی عملاً حکومت کی جیت ہوگی اور اسے بالادستی مل جائے گی۔ اس ضمن میں انگریزی روزنامہ ڈان ۵ جولائی کا ادارتی شذرہ اور ۷ جولائی کو اسی اخبار کے صفحہ ۱۰ پر چھپنے والا مضمون: 'ترکی میں جمہوریت کا معلق مستقبل' جو گارجین لندن کے مضمون نگار ماؤرین فریلے (Maureen Freely) نے لکھا ہے، قابلِ ملاحظہ ہیں۔

نیوزویک کے تازہ شمارے (۲۱ جولائی) میں ترکش ڈیلی نیوز کے ڈپٹی ایڈیٹر اور مشہور تجزیہ نگار مصطفیٰ اکیول نے 'ترکی کے خلاف سازش' کے عنوان سے جو تجزیہ کیا ہے اس میں لادین عناصر کی شدید مذمت کے ساتھ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حکمران پارٹی اور اس کی قیادت پر پابندی کی صورت میں وقتی طور پر اگلی پارلیمان پھر معلق ہوگی اور نئی حکومتوں کو جرنیل اپنے اشاروں پر نچائیں گے، تاہم اس کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے طویل المیعاد تناظر میں اردوگان کی پارٹی مزید مضبوط ہوگی۔

ہماری رائے میں حکمران پارٹی پر پابندی لگنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اعلیٰ قیادت کو بھی سیاست سے خارج بلکہ پابند سلاسل بھی کیا جا سکتا ہے۔ ترکی میں اب تک ۲۵ پارٹیوں پر پابندی لگ چکی ہے۔ ان میں زیادہ تر کرد یا کمیونسٹ تھیں۔ اس سے پہلے اسلامی پارٹی پر پانچ مرتبہ پابندیاں لگیں۔ اسلامی پارٹی واحد پارٹی ہے جس نے پابندیوں سے ہمیشہ عوامی تائید میں اضافہ کیا ہے۔ اگر پابندی لگتی ہے تو یہ فیصلہ اور اس کے بعد کا منظر سیکولر طبقات کے لیے کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہوگا۔ ہم ترکی کے اسلام دوست حلقوں کو یہی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ صبر و استقامت اور حکمت کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں۔ ''شرِّ برانگیز دعدو کہ خیر ما در آں باشد''۔